فتویٰ اور اصول فتویٰ: چوتھی قسط:

فتوی دینے کے اصول وھدایات

ضبط وترتیب

مولانا مفتی ابوالحسن عظمت اللہ بنوی

استاد شعبہ تخصص فی الفقہ بجامعہ المرکز الاسلامی پاکستان بنوں

شرکاء تخصص فی الفقہ والافتاء کے لئے علمی ابحاث پر مشتمل مضمون جو درحقیقت حضرت الاستاد الاکبر فقیہ العصر مولانا مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ نے موقعہ بموقعہ دورانِ درس درجہ ذیل باتیں املاء کرنے کی تاکید کی تھی اہل علم وتحقیق حضرات کے دلچسپی کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ازمدیر مسئول .....

فقہ اسلامی کے مأخذ ومراجع:

مأخذ کی تعریف:

مأخذ سے مراد وہ ذرائع ہیں جن سے قانون اخذ کیا جاتا ہے۔

مأخذ کی قسمیں:

کتب قانون میں مآخذ کی دو قسمیں ہیں، مآخذ صوری، مآخذ مادی:

ماخذ صوری قانون کا وہ ماخذ ہے جس سے قانون اپنا جواز واثر حاصل کرتا ہے۔

اور مادی وہ مأخذ ہے جس سے قانون اپنے مواد حاصل کرتا ہے۔

فقہ اسلامی کے مادی مأخذ:

علامہ شاطبی فرماتے ہیں: الادلة الشرعية ضربان احدما يرجع الى النقل المحض والثانى مايرجع الىٰ الرأى فاما اصل الاول الكتاب والسنة واما الثانى فالقياس والا ستدلال . وان الادلة الشرعية محصورة فى اصلها لا نالم نثبت الضرب الثانى بالعقل بل استثنا ه بالأول اذمنه قامت صحة الاعتماد عليه . (الموافقات ص ۴۱).

فقہ اسلامی کا دوسرا مأخذ سنت ہے:

اصطلاح فقہ میں آنحضرت ﷺ کے اقوال وافعال اور تقریرات ہیں۔ اور اقوال صحابہ تابع سنت ہیں۔

نورالانوار میں ہے:" السنة تطلق علیٰ قول الرسول وفعله وسکوته وعلیٰ اقوال الصحابة وافعالهم " .

قرآن کریم میں سنت کو بنیادی شریعت وحکم قرار دیا گیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: " انا انزلنا الیک الکتب بالحق لتحکم بین الناس م " ..... (نساء ۱۶) .

علامہ شاطبیؒ فرماتے ہیں:

" فکانت السنة بمنزلة التفسیر والشرح المعانی الاحکام وای الکتاب "

نیز حضرت عمرؓ نے قرآن فہمی کے سلسلے میں سنت کی تشریحات کو بنیاد بناتے ہوئے فرمایا ہے:

" سیاتی قوم یجادلونکم شبهات القرآن فخذوهم بالسنن فان اصحاب السنن اعلم بکتاب اللہ تعالیٰ ".(المیزان للشعرانی ص ۱/۵۳).

سنت کے بارے میں ائمہ اربعہ کا قول:

لولا السنن مانفهم احدمنا القرآن (المیزان ص ۱/۵۵).

ترجمہ: اگر سنتیں نہ ہوتیں تو ہم میں سے کوئی بھی فہم قرآن نہ کر پاتا۔

فرمودات نبوی کی عمومی حیثیت سے دو قسمیں ہیں:

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے آپ کے فرمودات کی عمومی حیثیت سے دو قسمیں بیان کی ہیں ایک وہ جن کا تعلق پیغمبرانہ فرائض اور تبلیغ رسالت سے ہیں۔اس میں عقائد اخلاق، عبادات، معاملات، مآدوغیرہ سے متعلق تفصیلات شامل ہیں۔

اور دوسری قسم وہ جن کا تعلق شورہ اور رائی سے ہے۔ چنانچہ اس قسم میں سیاسی مصلحت سے متعلقہ احکام، وہ امور جن کو شخص، قومی، ملکی عادات ورواج کے مطابق اختیار کیا گیا ہو۔ یا عربوں کے بعض تجربات، علاج زراعت، باغبانی وغیرہ کے متعلق تفصیل ہیں۔

فقہ اسلامی کا تیسرا ماخذ اجماع ہے:

اجماع لغت میں عزم واتفاق کو کہتے ہیں۔اصطلاح فقہاء میں اجماع کسی معاملہ میں اہل حل وعقد کے اتفاق کو کہتے ہیں۔

اجماع کا حجت ہونا کتب وسنت سے ثابت ہے۔

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔یاایهاالذین امنو اطیعو الله واطیعوالرسول واولی الأمر منکم .(نساء ۷۴)

ترجمہ:''اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور ان کا جو صاحب امر ہیں''۔

اکابر علماء اور فقہاء کرام نے اس آیت سے اجماع کو ثابت کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اجماع کا منکر جہنمی نہیں۔حدیث میں ہے کہ اللہ کا

ہاتھ ہے مسلمانوں کی جماعت پر جس نے جداراہ اختیار کی وہ دوزخ میں جا پڑا۔

نیز حضرت عبداللہ بن مسعود کا قول ہے: "ما رأه المسلمون حسنا فهو عند الله حسن" .

اجماع کی دو قسمیں ہیں:

مولانا عبدالحی صاحبؒ السعایۃ میں فرماتے ہیں کہ عصر حاضر کے مجتہدین کا کسی حکم پر اتفاق کر لینا اجماع شرعی کہلاتا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں، بسیط و مرکب، اگر کسی حکم میں اتفاق علت میں اتفاق کے ساتھ ہو تو یہ اجماع بسیط ہے۔

" كنقض الوضوء بالخارج من احد السبيلين " .

اور اگر کسی حکم پر اتفاق علت میں اختلاف کے ساتھ ہو تو یہ اجماع مرکب ہے۔

"فان استنبط المجتهدون فی عصر حكماً واتفقوا عليه يجب علىٰ اهل عصر قبوله فاتفاقهم صاربينة علىٰ ذالک الحكم فلا يجوز بعد ذالک مخا لفتهم " .(اھ)

فقہ اسلامی کا چوتھا ماٰخذ قیاس ہے:

لغت میں اس کے معنی اندازہ کرنا اور مساوات پیدا کرنا ہے اصطلاحِ فقہاء میں قیاس علت اور حکم میں فرع کو اصل کے ساتھ برابر کر دینے کا نام ہے۔ یہی تعریف اصول فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے۔

قیاس کی حجیت:

قیاس کا حجت ہونا کتاب وسنت اور اجماع امت تینوں سے ثابت ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: " فاعتبروا ياولىٰ الابصار و " . (سورة الحشر) .

" پس اعتبار کرو اے نگاہ والو " ۔

منہاج الاصول میں روایت ہے کہ حضرت معاذؓ اور ابوموسیٰ اشعریؓ دونوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے ایک ایک علاقہ کا قاضی بنا کر بھیجا تھا اور دونوں سے دریافت کیا تھا کہ فیصلہ کس طرح کرو گے جواب میں دونوں نے عرض کیا تھا۔

"اذالم نجدالحكم فی السنة نقيس الامر باالامر فما كان اقرب الىٰ الحق علملنا به فقال عليه السلام اصبتما .

(بحواله مقدمة السعاية ص ۵۲).

صحابی کے عمل سے قیاس کا ثبوت:

حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کلالہ کے وراثت کے بارے میں حکم دریافت کیا گیا تو فرمایا: اقول فيها برأى فان يكن صواباً فمن الله وان يكن خطأً فمنى ومن الشيطان . (منهاج)

شروط قیاس:

(۱) اصل حکم خلاف قیاس نہ ہو۔

(۲) فرع میں کوئی نص صریح نہ ہو۔

(۳) حکم میں تعدیت کی صلاحیت ہو تو بوقتیکہ فرع اصل کے نظیر ہو۔

(۴) فرع میں حکم میں متغیر نہ ہو۔

(۵) قیاس نص صحیح معمول بہ کے معارض ومنافی نہ ہو۔

(۶) فرع نزول حکم کے حوالے سے اصل سے مقدم نہ ہو بلکہ فرع باعتبار الحکم مؤخر ہو اصل سے" کوجوب النیة فی التیمم فلا یقاس علیه النیة فی الوضو لان حکم لتیمم نزلت بعد الهجرة والوضو قبلها".

استحسان:

درحقیقت ہی قیاس ہی کی ایک نوع ہے۔ جو ادلۂ اربعہ میں داخل ہے۔ اور کسی وجہ سے قیاس جلی کو ترک کر کے اس کو اختیار کیا جائے۔ استحسان (قیاس خفی) اس دلیل کو کہتے ہیں جو قیاس جلی کی معارض ہو یعنی قیاس جلی ایک حکم چاہتا ہو اور اثر (اجماع)، ضرورت، اور قیاس خفی اس کی ضد کو چاہتا ہو تو قیاس کو چھوڑ کر استحسان کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ استحسان بالاثر جیسے بیع سلم کہ قیاس مقتضی عدم جواز ہے کیونکہ بیع سلم میں معدوم کی بیع ہوتی ہے حالانکہ بیع کے لئے بیع کا موجود ومملوک اور مقدور التسلیم ہونا ضروری ہے۔

مگر اس قیاس کو نبی ﷺ کے اس قول پر" من اسلف فی شئی فلیسلف فی کیل معلوم ووزن معلوم الیٰ اجل معلوم اور استحسان باالاجماع ".

کما فی الاستصناع بغیر ذکر الاجل والا ستحسان بالضرورة کعدم طهارة الاولیٰ لأنها لاتنعصر بالعصر والا ستحسان بالقیاس الخفی کطهارة السباع الطیور لا نها تاکل بمنقارها وهو عظم طاهر".

صحابہ کے طرز عمل سے استحسان کا ثبوت:

" کزوجة ماتت وترکت زوجاً وأمّاً واخوین شقیقین والا خوة لام خفی الصورة المذکورة للزوج النصف والسدس للام والثلث للا خوة لام قیاسی"

قاعدہ کے مطابق اس تقسیم سے سگے بھائی کو محروم ہونا پڑا۔ حضرت عمرؓ کے سامنے جب یہ واقعہ پیش ہوا تو انہوں نے سگے بھائیوں کے نقصان دفعیہ کی غرض سے قیاسی قاعدہ چھوڑ دیا اور ان کو ماں شریک بھائیوں میں شامل کر کے تہائی میں سب کو حقدار بنایا۔

فقہ حنفی میں مفہوم مخالف کا اعتبار:

زبان سے جو بات نکلتی ہے اس کے دو مطلب ہوتے ہیں۔ایک منطوق کلام دوسرا مفہوم کلام منطوق اصولیین اور علماء معانی کی اصطلاح میں ہو۔" مادل علیه صریح اللفظ وسیاق العبارة دلالة اللغویة " . کو کہا جاتا ہے۔(معارف السنن ۱/۵۵).

اور مفہوم "ما یستنبط من فحوی الکلام ".(معارف السنن ۱/۵۵).

یعنی مفہوم کلام سے اس کا استنباط اور استخراج ہوتا ہے ظاہر الفاظ اس پر دلالت نہیں کرتے بلکہ وہ کلام میں غور اور فکر کرنے سے نکالا جاتا ہے۔

مثلاً قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: " ولا تقل لهما اُفٍ " . (الایة) .

کہ والدین کو اُف نہ کہو اس آیت کا ظاہری معنیٰ اُف کے معنیٰ پر دلالت کرتا ہے۔

ظاہر الفاظ سے سب وشتم یا مارنے کی کوئی ممانعت نہیں مگر غور فکر کرنے کے بعد سب وشتم اور مارنے کی حرمت اس آیت سے مستنبط ہوتی ہے اس کو مفہوم الکلام کہا جاتا ہے۔

مفہوم کے اقسام:

مفہوم کلام کی دو قسمیں ہیں:

(۱) مفہوم موافق ،(۲) مفہوم مخالف۔

اگر کلام کا مفہوم منطوق کلام کے موافق ہو یعنی مفہوم بھی اس حکم کے اثبات پر دلالت کرے جس کے اثبات پر منطوق دلالت کرتا ہے۔تو اس کو مفہوم موافق کہا جاتا ہے۔

اور اگر مفہوم کلام منطوق کے ضد کو ثابت کرے تو اس کو مفہوم مخالف کہا جاتا ہے۔

اور اس کو دلیل خطاب بھی کہا جاتا ہے۔

مفہوم مخالف کے اقسام:

مولانا یوسف بنوریؒ نے معارف السنن میں مفہوم مخالف کے دس اقسام ذکر کیے ہیں۔

(۱) مفهوم الصفة، (۲) مفهوم الشرط ، (۳) مفهوم علت ، (۴) مفهوم غاية ، (۵) مفهوم عدد ، (۶) مفهوم لقب ، (۷) مفهوم استثناء ، (۸) مفهوم حصر ، (۹) مفهوم زمان ، (۱۰) مفهوم مکان .(معارف السنن ۱/۵۵).

مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ (رئیس مفتی دارالعلوم دیوبند) نے ان دس اقسام سے پانچ اہم اقسام کی کی تعریفات مع امثلہ ذکر فرمائی ہیں۔تفصیل ذیل میں ہے۔

اول مفہوم الصفت:

کہ کوئی حکم اسم صفت پر لگائی جائے تو جہاں وہ صفت نہ رہے گی تو حکم بھی نہ رہے گا۔ جیسے کہ حدیث نبوی ﷺ ہے۔ "فی السائمة زکوٰة" یعنی جنگل کی گھاس پر چرنے والے جو پائیوں میں زکوٰۃ ہے۔ اس قول میں لفظ السائمۃ اسم مشتق ہے جو صفت پر دلالت کرتا ہے۔ پس جو جانور سائمۃ نہ ہوں گے بلکہ علوفۃ ہوں گے ان میں زکوٰۃ نہ ہوگی۔

" ولقوله عليه الصلوٰة والسلام فی کل ذات کبر رطة اجرفان وصف رطوبة الکبریعم جمیع الحیوانات کان ذالک دلیلا علیٰ نفیه ای نفی الحکم عند عدم ذالک الوصف کما لو نص علیه اه ".

(کشف الاسرار ۲/ص ۲۵۶).

ثانی مفہوم شرط:

کوئی حکم کسی شرط کے ساتھ معلق کی جائے تو شرط جب منتفی ہوگی تو حکم بھی منتفی ہوگا۔ جیسے قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

" وان کن اُولات حمل فانفقوا علیهن " . (الایة) .

اور اگر مطلقہ عورتیں حمل والی ہو تو حمل پیدا ہونے تک ان پر خرچ کرو۔

اس آیت میں نفقے کو وجوب حالت حمل پر موقوف رکھا گیا ہے تو جب حمل کا وضع ہو جائے تو پھر نفقہ لازم نہ ہوگا۔

ثالث مفہوم غایت:

یعنی حکم کی کوئی حد مقرر کی گئی ہو تو اس غایت پر حکم خود بخود منتفی ہو جائے گا۔ جیسے (حتیٰ تنکح زوجا غیرہ) . (الایة)

مطلقہ ثلاثہ شوہر کے لئے حرام ہے یہاں تک کہ وہ اس شوہر اول کے علاوہ کسی اور شخص سے نکاح کر دے۔

گویا کہ شوہر ثانی سے نکاح کرنا اور ازدواجی زندگی قائم کرنے تک یہ عورت (مطلقہ ثلاثہ) شوہر اول پر حرام ہوگی اس کے بعد حرمت ختم ہو جائے گی اگر یہ دوسرا شوہر اس کو طلاق دے اور یہ عورت شوہر اول سے عدت کے بعد نکاح کرنا چاہتی ہو تو کر سکتی ہے۔

رابع مفہوم عدد:

یعنی حکم کے کوئی تعداد بیان کی گئی ہو تو وہ زائد کی نفی کریگا۔ جیسے قرآن کریم کا ارشاد ہے : " ثمانین جلدة " . (الایة) .

یعنی تہمت لگانے والوں کو اسی/۸۰ کوڑے مارو۔

اس آیت میں قاذف کے لئے حد قذف کی تعداد اسی/۸۰ کوڑے رکھی گئی ہے۔ اس سے کم یا زیادہ دونوں دینا جائز نہیں اس طرح غیر محض شخص جب زنا کرے تو قرآن کریم نے اس کے (مائة جلدة) (الایة) . یعنی سو کوڑے سزا رکھی ہے۔ اس لئے غیر محض شخص کو سو کوڑوں سے کم یا اس سے زیادہ مارنا جائز نہیں۔

الخامس مفہوم لقب:

یعنی حکم کسی اسم جامد پر معلق کیا جائے فی الغنم زکوٰۃ کہ بھیڑ بکریوں میں زکوٰۃ ہے۔اھ (آپ فتویٰ کیسے دیں۔ص ۱۰۴) اس حکم شرعی میں زکوٰۃ غنم کے ساتھ معلق کیا جائے اور لفظ غنم لغت میں بھیڑ بکریوں دونوں کو شامل ہے۔

" وتسکو ابقوله علیه السلام الماء من الماء فلا یوجب الغسل بالا کسال روتمسک الجمهور بقوله تعالیٰ فلا تظلموا فیهن انفسکم ای فی الأشهر الاربعة الحرم وهی رجب وذوالقعده وذوالحجة والمحرم ولم یدل ذالک علیٰ اباحة الظلم فی غیرها. وقال تعالیٰ ولا تقولن لشئی انی فاعل ذالک غدا الاان یشاء الله ای الا ان شاء الله ثم لم یدل ذالک علیٰ تخصیص الاستثنا با لغدون غیره ام " . (کشف الاسرار ج ۲/ص ۲۵۴).

السادس مفہوم العلۃ:

یعنی حکم کسی علت کے ساتھ معلق ہو جیسے آپ ﷺ نے زکوٰۃ لینے سے بنی ہاشم کو منع کیا ہے اور اس کی ''علت اوساخ الناس یا خمس'' قرار دیا ہے۔

السابع مفہوم الاستثناء:

یعنی کوئی حکم استثناء کے ذریعہ ماقبل حکم سے نکلا جائے جیسے کہ مثال کے طور پر " (الا من اغترف غرفة بیده) والا من ضطر ".

الثامن مفہوم الحصر:

یعنی حکم کو کسی خاص شئی کے ساتھ منحصر کیا ہو جیسے " الحج العرفة " کہ حج عرفہ کا نام ہے یعنی حج کی ادائیگی وقوف عرفہ میں منحصر ہے۔

التاسع مفہوم الزمان:

یعنی حکم کسی زمانہ کے ساتھ معلق ہو جیسے (ان الصلوٰة کانت علی المؤمنین کتابا موقوتاً) اسی طرح (من شهد منکم الشهر فلیصمه) . کہ رمضان کا فرض روزہ شہر رمضان کے ساتھ معلق ہے۔

العشرۃ مفہوم المکان:

یعنی حکم شرعی کسی خاص مکان کے ساتھ متعلق ہو۔

جیسے (والیطوفوا بالبیت العتیق) یعنی حکم طواف صرف بیت اللہ یعنی خانہ کعبہ کے ساتھ خاص ہے کسی اور جگہ کا طواف کرنا جائز نہیں۔

مفہوم کا حکم:

ائمہ مجتہدین کا اجماع اور اتفاق ہے کہ مفہوم موافق معتبر ہے اس لئے کہ وہ دلالت النص سے حکم کا اثبات کرتا ہے۔

البتہ مفہوم مخالف میں ائمہ کا اختلاف ہے شوافع اور متبع مفہوم مخالف مفہوم لقب کے علاوہ مطلقا حجیت کے قائل ہیں اور جملہ اقسام کو معتبر مانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شوافع کے ہاں مطلقہ بائنہ جو حاملہ نہ ہو شوہر کو ایام عدت میں نفقہ دینا لازم نہیں۔ اور نہ علوفہ یعنی گھر میں پالتو جانور میں زکوۃ ہیں وغیرہ۔

احناف کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ ان کے ہاں مفہوم مخالف کا کوئی اعتبار نہیں لیکن محققین کے تحقیق کے مطابق حنفیہ کا یہ مذہب نہیں۔ کہ مفہوم مخالف کا کوئی اعتبار نہیں علامہ محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"والحق ان نفیہ' مطلقاً غیر صحیح" کما ان اثباتہ مطلقاً کذلک غیر صحیح بل یحتاج الیٰ بیان نکات وفوئد اللشروط والقیود والصفات التی وردت فی النصوص . (معارف السنن ۱/۵۵).

ہاں ایسا نہیں کہ اس مفہوم مخالف سے حکم منصوص کو رد کیا جائے بلکہ مفہوم مخالف سکوت عنہ حکم کے لئے دلیل بن سکتا ہے۔ (معارف السنن ۱/۵۵)۔

امام المحدثین علامہ انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں:

" اعتبار ۃ فی مرتبۃ الحکمۃ والنکۃ والفائدۃ . لا ن الکلام البیغ یقتضی ذلک کیلا یشتمل علی حشو فی الکلام ولغو فی الغرض وایضاً لو لم نعتبرہ فی ھذہ المرتبۃ لالغیت فائدۃ القیود والصفات فی کلام البلیغ وکلام اللہ سبحانہ' . (معارف السنن ۱/۵۵).

اس لئے علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں:

کہ حنفیہ کے نزدیک نصوص شرعیہ یعنی کلام اللہ اور کلام رسول اللہ ﷺ کے مفہوم مخالف معتبر نہیں البتہ کلام فقہاء مجتہدین اور عوام الناس میں معتبر ہے۔ (رسائل شرح عقود ۱/۴۱)۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ حنفیہ نصوص میں غایت احتیاط سے کام لیتے ہیں۔

اس لئے کہ شارع علیہ السلام کا غرض از کلام بہت دقیق ہوتی ہے۔ کبھی اس کی ادراک انسانی عقول سے بہت دور ہوتا ہے۔ اس لئے ان کے ہاں نصوص میں مفہوم مخالف کا اعتبار نہیں۔ (معارف السنن ۱/۵۶)۔

اور فقہاء کے عبارات میں اعتبار دینے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے کلام کا غرض اقرب الی الفہم ہوتا ہے جس کے ادراک میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔

علامہ ابن ھمام کتاب التحریر میں فرماتے ہیں:

" والحنیفۃ ینفون مفھوم المخالفۃ باقسامہ فی کلام الشارع فقط " .

چنانچہ التحریر کے شارح ابن امیر الحاج جو ابن ھمام کے شاگرد ہیں:

شمس الائمۃ الکردری سے نقل کرتے ہیں۔

" ان تخصیص الشئی بالذکر لایدل علی نفی الحکم عما عداہ فی خطابات الشارع فا ما فی متفاھم الناس وعرفھم فی المعاملات والعقلیات فیدل اہ ". (معارف السنن ۱ / ۵۶).

اعتبار کی مثالیں:

فقہی عبارات میں مفہوم مخالف کے اعتبار کی بہت سی مثالیں ہیں مثلاً صاحب ھدایہ علامہ مرغینانی غسل کے بحث میں فرماتے ہیں کہ عورت پر پٹی ہوئی چوٹیاں کھولنا واجب نہیں شارحینؒ نے لکھا ہے کہ عورت کے لفظ سے مرد سے احتراز مقصود ہے چونکہ اگر مرد نے چوٹیاں بٹی ہوئی ہو تو اس کے کھولنا ضروری ہے۔

اس طرح صاحب ہدایہ نے کتاب الحج کے باب الجنایات میں لکھا ہے۔ کہ جب درندہ کسی حاجی پر حالت احرام میں حملہ کردیں اور محرم اپنے بچاؤ کے لئے اس کو قتل کردیں۔ تو اس پر محرم پر کوئی جزاء لازم نہیں۔ شارحین نے لکھا ہے کہ اگر محرم ابتداء کرے تو اس پر اس درندے کہ جزء لازم جیسا کہ قرآن کا حکم ہے۔

اس کے علاوہ بھی کافی ساری مثالیں فقہی ذخائر میں موجود ہے جس میں مفہوم مخالف کا اعتبار کیا گیا ہے۔

صحابہ کرام کے اقوال:

علامہ ابن عابدین شامیؒ نے شرح عقود رسم المفتی میں لکھا ہے کہ صحابہ کرام کے اقوال دو طرح کے ہیں۔

(۱) وہ اقوال جو مدرک العقل نہیں یعنی اس میں رائے اور اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں ہوتا اسے ارشادات چونکہ حکماً مرفوع ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں بھی احادیث نبوی ﷺ کی طرح مفہوم مخالف معتبر نہیں۔

(۲) اور جن اقوال میں رائے اور اجتہاد کی گنجائش ہوسکتی ہو تو اس میں مفہوم مخالف معتبر اور اس کے عوض ایک دنبہ ذبح کیا اور فرمایا کہ ہم نے ابتداء کی تھی۔

آپ کے قول ہم نے ابتداء کی تھی سے صاف ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کا مقصد یہ ہے۔ کہ جب درندہ ابتداء کرے تو پھر جذا لازم نہیں۔

شارح کے اقوال: امام محمدؒ نے سیر کبیر۔ کے بعض عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے قول شارح میں بھی مفہوم مخالف کو اعتبار دیا ہے۔

" ان رسول اللہ کتب الی مجوس ھجر بدعوہ الی الاسلام فمن اسلم قبل منه ومن لم یسلم ضربت علیه الجزیة وان لایؤ کل لھم ذبیحة ولاینکح لھم امرأة ".

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر مجوس کو مراسلہ روانہ فرمایا جس میں ان کو اسلام کی دعوت دی پھر جو مسلمان ہوجائے اس کا اسلام قبول کرلیا جائے اور جو مسلمان نہ ہوا اس پر جزیہ مقرر کیا جائے اور مجوسیوں کا ذبیحہ نہ کھایا جائے نہ ان کی عورتوں سے نکاح کیا جائے۔

علامہ سرخسیؒ شرح میں لکھتے ہیں:

" مکانہ استدل بتخصیص رسول اللہ المجوس بذلک علی انہ لابأس بنکاح نساء اھل الکتاب فانہ بنی ھذا الکتاب علی ان المفھوم حجۃ " . (سیر کبیر ۱/۱۴۹)

گویا امام محمدؒ نے رسول اللہ ﷺ کے مجوسیوں کے اس حکم کے ساتھ تخصیص فرمانے سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کی گنجائش ہے۔ کیونکہ امام محمد نے اپنی کتاب کا مدار اس بات پر رکھا ہے کہ مفہوم مخالف حجت ہے۔

امام محمدؒ کی اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ قول شارح میں بھی مفہوم مخالف کو معتبر مانتے ہیں۔ مگر اکثریت کی رائے نصوص میں معتبر نہیں اصح اور اولیٰ ہے۔ البتہ جہاں قرینہ ہو یا کسی کوئی اور دلیل جو اس بات پر دلالت کرے کہ شارع علیہ السلام کے اس قول میں مفہوم مخالف معتبر ہے۔

یا کسی نکتہ کے لئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہو تو ان جملہ صورتوں میں معتبر ہوگا۔ ورنہ عمومی طور پر معتبر نہیں جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

" وربائبکم التی فی حجورکم الایہ " یعنی حرام کی گئی تمہاری بیویوں کی بیٹیاں جو تمہاری گود میں (پرورش) میں ہے۔

اس آیت میں حجور کی قید کا فائدہ بالاجماع یہی ہے کہ عام طور پر بیوی سابق شوہر سے لڑکی دوسرے شوہر کی پرورش میں ہوتی ہے۔ لیکن جب مطلب کسی کے ہاں نہیں۔ کہ اگر وہ لڑکی موجود شوہر کی پرورش نہ ہو بلکہ سابق شوہر کے کسی رشتہ دار کسی اور شخص کی پرورش میں ہو تو شوہر کی نکاح جائز ہے۔

لہٰذا اگر نصوص میں مفہوم مخالف کا اعتبار کیا جائے تو اسی صورت میں اپنی بیٹی (ربیبۃ) سے نکاح لازم آئے گا جو بالاجماع حرام ہے۔ اس لئے معلوم ہوا کہ نصوص میں مفہوم معتبر نہیں۔

فقہی روایات میں اگرچہ معتبر ہے لیکن اعتبار کی وجہ سے عرف اور عادت ہے اور فقہاء الثابت بالمعرف کالثابت بالنص اور المعروف کالمشروط سے قواعد سے عمومی طور پر استدلال کرتے ہیں۔ چونکہ لوگوں نے اپنے محاورات میں مفہوم مخالف کو اعتبار دیا ہے۔ اس لئے کلام الناس میں معتبر ہے۔

فقہاء اور علماء کی اپنی کتابوں میں یہ عادت رہی ہے کہ قیود اور شروط وغیرہ میں یہ تنبیہ کرتے ہیں کہ جہاں یہ قید بالشرط نہ ہو وہ حکم سے خارج ہے۔ اس لئے فقہی عبارت میں بھی مفہوم کو اعتبار ہے۔ بلکہ فقہی ذخائر میں یہ قاعدہ کلیہ نہیں بلکہ کبھی کبھی فقہی روایات میں بھی معتبر نہیں ہوتا۔

مثلاً: معتبرات فقہ میں ہے۔ کہ طہارت کے سنن میں شامل ہے کہ کوئی شخص دونوں ہاتھوں کو برتن میں نہ ڈالے جب وہ نیند سے بیدار ہو جائے جب تک ان دونوں ہاتھوں کو اچھی طرح دھو نہ لے۔

اس مسئلہ میں نیند سے بیداری کی قید اتفاقی ہے۔ اس لئے کہ جب بھی کوئی شخص نے وضوء ہو جائے تو اس برتن میں ہاتھ ڈالنے سے قبل

دھونا ضروری ہے۔ یہ حکم صرف نیند سے بیدار کے لئے خاص نہیں۔ البتہ فقہی عبارات میں بھی حجت ہے۔ جب وہ کسی صریح ثابت شدہ حکم وہ بات کے مخالف نہ ہو ورنہ صریح حکم مقدم ہوگا۔

قال: ابن نجیمؒ فی الأشباہ قولہ: لایجوز الاحتجاج بالمفہوم فی کلام الناس فی ظاہر المذہب کاالأدلة اہ قال البیر فی حاشیة قولہ: کاالأدلة الخ. اقول نظیر ذالک تخصیص التیٔ بالذکر لایدلّ علیٰ نفسی الحکم مما عداہ فی خطاب الشرع ، واما فی الروایات فیدل ذکر ابن الکمال فی فعل الجنایات علیٰ الصید فی اشرح الہدایة من کتاب الحج:

ثم قال ابن نجیمؒ: وما ذکرہ محمد فی السیر الکبیرة من جواز الاحتجاج بہ فہو خلاف ظاہر المذہب کما فی الدعویٰ من الظہیریة وأما مفہوم الروایة فحجة کما فی غایة البیان ، قال الحموی في حاشیة قولہ: واما مفہوم الروایة فحجة الخ (اقول : وکذالک مفہوم التصنیف حجة ذکرہ فی انفع الوسائل ہذہ ولا یقال فی مفہوم الروایات: ینبغی بل ہو مفہوم عبارة الأصحاب ذکرہ المصنف فی الشرح فی کتاب الوقف ، وانما کان المفہوم حجة عند نا فی الروایة دون النصوص لان المفہوم فیہا لیس بمقصود، بخلاف کلام الأصحاب فانہ فیہ مقصود ، فیکون حجة فیہا ، ہذا ہو الفرق بینہما ، وانہ قد خفی علیٰ کثیر ین واحفظ واحتفظ بہ اہ کذا فی الزہر الباد رعلی فصول العماد ی .

معزیا لمولانا عبدالبربن الشحنہ اہ :

" وظاہر قول المصنف مفہوم الروایة حجة انہ حجة ولو کان مفہوم مخالفة قال العلامة القہستانی فی الشرح النقایة فی کتاب الطہارة : ان مفہوم المخالفة فی الروایة مفہوم الموافقة معتبر بلا خلاف کام ذکرہ المصنف یعنی صدر الشریعة فی کتاب النکاح ثم قال: لکن فی اجارة الزاہدیٰ انہ غیر معتبر الحق انہ معتبر الا انہ اکثری اہ کما فی حدود القنیة اہ " .

(الاشباہ والنظائر مع حاشیة المحموی ج : ۲/ص ۱۹۳ کتاب القضاء والشہادة والدعوی) .

القواعد التی تجری فی الفقہ الحنفی کالاصول لأساسیة تحت المفہوم والمنطوق :

کلام لہ منطوق ، وہو مایدل علیہ صریح للفظ دلا لة لغویة، ولہ مفہوم وہو مایستنبط من فحوی الکلام ، فان کان المفہوم موافقا للمنطوق یسمیٰ مفہوم الموافقة ، فحوی الخطاب، وان کان المفہوم مخالف وضدالحکم یسمی ، مفہوم المخالفة . ودلیل الخطاب، وینقسم مفہوم المخالفة الیٰ:

مفہوم الصفة ، والشرط، والعلة ، والغایة، والعدد، واللقب ، والا ستثناء، والحصر، والزمان ، والمکان ،

فاتفق المجتهدون فی قبول ومفهوم والموافقة، واختلفوا فی "مفهوم المخالفة "

" فالامام الشافعی واتباعه ، رحمهم الله ، اتفقوا علیٰ حجیة مفهوم المخالفة ، بأقسامه فالمفهوم المخالف عندهم حجیة شرعیة .وان کانت ظنیة. فجعلوا التخصیص علی الشئ ولاتخصیص بذکره دلیلاً شرعیاً علیٰ نفی الحکم عما عداه .والحنفیته لایعتیرونه حجة شرعیة بهذٰه المشابهة " .

قال الشیخ ابن الهمام : روالأحناف ینفون مفهوم (المخالفة) بأقسامه فی کلام الشارع فقط ، یعنی أن تخصیص الشئی بالذکر لایدل علیٰ نفی الحکم عما عداه فی خطا بات الشرع فأما فی متفاهم الناس وعرفهم وفی المعاملات والعقلیات فیدل أه . (فتاویٰ تتارخانیه ج ۱ / ۲۱).

الدلیل لنا من الاصول علیٰ عدم اعتبار المفهوم فی کلام الشارع تقدالتحقیق ان اقصیٰ درجات الوصف اذا کان المؤثر ان یکون علة الحکم مثل السارق والزانی ولا اثر للعلة فی التقی ومثال هذٰ ایضاً فی قوله تعالیٰ من فیتا تکم المؤمنات فهذا الا یوجب تحریم نکاح الأمة الکتابة عندنا لما قلنا اه (کشف الاسرار ج ۲ / ۲۵۹).

تمرین فتوی:

تمرین افتاء میں سب سے پہلا مرحلہ سوال کا انتخاب ہے۔اس میں مندرجہ ذیل باتوں کا اہتمام ضروری ہے:

الف:۔سال اول میں ابتداءً آسان استفتاء لیا جائے، اگر سوال ایسا ہو کہ جس میں کوئی نہ کوئی جزئیہ مل سکتا ہو تو وہ بہتر ہے، البتہ ہر وقت آسان اور جزئیہ والے استفتاء ہی ملنا ضروری نہیں، اس لئے اساتذہ کرام کے مشورے سے دوسرا استفتاء بھی لیا جاسکتا ہے

ب:۔ ہر قسم کے موضوع کے استفتاء لیکر حل کرنے کی کوشش ہونی چاہیے، صرف ایک ہی موضوع مثلاً نماز یا زکوٰۃ یا چند مخصوص موضوعات سے تمرین نہ ہو سکے گی، جو آگے چل کر مشکل کا سبب ہوگی۔

ج:۔استفتاء لینے سے قبل اس رجسٹر میں اندراج ضروری ہے، تاکہ ضرورت پڑنے پر جلد تلاش کیا جاسکے، ہر استفتاء پر اندراج نمبر ہوگا، رجسٹر میں مجیب کا نام، مستفتی کا نام اور اندراج نمبر کے ساتھ وصولی کی تاریخ درج ہوگی، اسی طرح حل کرنے کے بعد جمع کروا کر واپسی کی تاریخ درج کی جائے گی۔ڈاک سے آمدہ استفتاء لیتے ہوئے جوابی لفافہ اور استفتاء پر درج جوابی پتہ کو ملا کر تسلی کر لی جائے، اور مناسب معلوم ہو تو جوابی لفافے پر ایسی علامت لگائیں جس سے خلط کا امکان باقی نہ رہے، اور نہ کسی ایک کا جواب دوسرے کے لفافے میں جانے کا قوی خطرہ ہے۔

دوسرا مرحلہ حل استفتاء ہے:

اس میں دو کام بنیادی ہوتے ہیں: نکتۃ الغور کی تعیین اور مراجع ومظان مسئلہ (جہاں مسئلہ ملنے کا گمان ہو) کا درست انتخاب،

جواب کی صحت ان دونوں امور کے صحیح طور سے انجام دینے پر موقوف ہے، لہٰذا اس میں پوری جانفشانی اور ہمت وچستی سے کام لیں، اس کا طریقہ سنداً دلہ یہ ہے:

نکتۃ الغور کی تعیین:

استفتاء لینے کے بعد کتب کی مراجعت سے پہلے اسے کئی بار اچھی طرح غور سے پڑھ کر اس کا تجزیہ وتحلیل کیا جائے، اہم نکات کو متعین کر دیا جائے، ضرورت محسوس ہو تو انہیں خط کشیدہ بنایا جائے، مستفتی نے کئی باتوں کو بے ترتیب جمع کیا ہوتا ہے، ان کی طرف التفات کے بجائے اصل مسئلہ کو سمجھنا اجزاء سوال کو ترتیب کر کے اس کا جواب سوچنا تمرین میں اصل ہے، نکتۃ الغور سمجھنے سے یہی مراد ہے۔

○ سوالات کے موضوعات بے شمار ہوتے ہیں، اور مفتی کے وسائل محدود، ایسا ممکن نہیں کہ ہر چیز اسے اپنے پاس دستیاب ہو سکے، محدود وسائل میں رہتے ہوئے جامع اور مستند تحقیق کا طریقہ ہے کہ وسائل جہاں موجود ہیں وہیں پہنچ کر ان سے استفادہ کیا جائے، اور مطلوبہ معلومات جس فن سے تعلق رکھتی ہیں، اس کے ماہر افراد سے حقیقت دریافت کی جائے، طبی امر کی تحقیق ڈاکٹروں سے کی جائے اور تجارتی معاملے کی دکانداروں سے بیمہ کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے بیمہ دفتر جایا جائے، اور آڑھتیوں کے معاملات سمجھنے کے لئے منڈی میں، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی مثال ہمارے سامنے ہے: وہ بازار میں آمد ورفت اور تاجروں کے ساتھ نشست وبرخاست رکھتے تھے، تاکہ ان کے درمیان رائج عقود کی حقیقت علی وجہ البصیرۃ معلوم کر سکیں، کسی نے ان سے اتنی محنت کرنے اور عامیوں کے پاس اٹھنے بیٹھنے کی مشقت برداشت کرنے کا سبب پوچھا تو فرمایا: "**ما ظنک فی رجل جعل الناس عنقه جرا یحرون علیها**". (او کما قال)

○ جواب لکھنے کا طریقہ احمقانہ ہے کہ آپ استفتاء پڑھتے ہی جھٹ سے کسی جزیئے کی تلاش میں لگ جائیں، افتاء کے باب میں اصل الاصول یہ ہے کہ سوال میں پوچھے گئے امر کی حقیقت کو سمجھیں، پھر اس پر عبارات فقہیہ کو صحیح طور سے منطبق کریں، اس طرز عمل پر کچھ عرصہ مشق کرنے سے افتاء کی اہلیت اور ملکہ فقہیہ پیدا ہو جاتا ہے، اس کے بغیر کثیر تعداد میں فتاوی لکھنے کے باوجود کامیابی کی ضمانت نہیں، مثلاً: ایک شخص نے سوال کیا کہ زید نے ایک شادی کی اس سے لڑکی پیدا ہوئی، اس کی شادی کروائی تو نواسی پیدا ہوئی، اس کو ایک شخص سے بیاہ دیا، بعد ازاں زید نے دوسری شادی کی، یہ بیوی فوت ہو گئی، پھر زید نے تیسرا نکاح کیا، اس سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، لڑکی جب جواں ہوئی تو زید اس کا نکاح بھی اپنے پہلے داماد سے کرنا چاہتا ہے، آیا یہ نکاح ہو سکتا ہے یا نہیں؟

اگر یہ صورت مسئلہ آپ کتابوں میں تلاش کرنا شروع کریں تو ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئیگا، کیونکہ فقہاء وعلام الغیب نہ تھے کہ قیامت تک کی تمام صورتوں کو صراحۃ لکھ دیتے، اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ پہلے اس مسئلہ کی حقیقت سمجھیں، پھر فقہی عبارات میں اس کا حکم تلاش کریں، اس معاملہ کی حقیقت یہ ہے کہ ایک شخص دو عورتوں کو نکاح میں جمع کرنا چاہتا ہے، اور یہ دو عورتیں آپس میں باپ شریک خالہ اور بھانجی ہیں، اب آپ باب المحرمات میں یہ مسئلہ تلاش کریں کہ خالہ (حقیقی) اور بھانجی کو نکاح میں جمع کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ بآسانی آپ مطلوبہ عبارت تلاش کر لیں گے۔

اس بنیادی نکتے کو ایک اور مثال سے سمجھیں:

ایک شخص نے کوئی چیز پاکستانی روپے (مثلاً) دس ہزار میں خریدی، مالک کو اس نے روپے دینے کے بجائے ڈالر کا چیک دیا، مالک نے چیک وصول کر کے بینک سے رابطہ کیا تو اس نے جواب دیا کہ اس اکاؤنٹ میں ڈالر موجود نہیں ہے، مالک نے خریدار سے رابطہ کر کے رقم کا مطالبہ کیا، اس عرصے میں چیک میں درج ڈالر کی قیمت دس ہزار سے بڑھ گئی، اب خریدار کہتا ہے کہ چیک واپس کرو میں آپ کو روپیہ دونگا، کیونکہ سودا اسی میں ہوا تھا، مالک کہتا ہے کہ اتنے قدر ڈالر ادا کرو جو تم نے روپے کے بدلے میں دینے منظور کئے تھے۔

ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ بھی آپ کو کسی کتاب میں صراحۃً نہیں مل سکتا، ہاں اگر تمرین افتاء کے صحیح طرز کو اپنا کر غور کیا جائے تو بآسانی اسے حل کیا جاسکتا ہے۔

سب سے پہلے ان دونوں کے درمیان کئے گئے معاملے کو فقہی اصطلاحات کی رو سے سمجھیں، روپے کے بدلے میں ڈالر کی ادائیگی پر فریقین کا رضامند ہونا ایک ورق نقدی کا دوسرے ورق نقدی کی سند کے ساتھ تبادلہ ہے، گویا کہ روپے کی بیع ڈالر کے ساتھ ہوئی، روپے بھی موجود نہیں واجب فی الذمۃ ہے۔ اور ڈالر بھی موجود نہیں، وہ بینک میں ہیں وہاں سے وصول کی تحریر (یعنی چیک) خریدار لکھ کر دے رہا ہے یہ بیع الدین بالدین ہوئی جو کہ ناجائز ہے، "للنهي عن بيع الكالئ بالكالئ"۔ لہٰذا یہ معاملہ اصل سے فاسد ہے، خریدار پر عقد کے مطابق روپے کی ادائیگی واجب ہے۔

اس سوال کا جواب تو ختم ہو گیا، لیکن اگر بطور مشق کے سوال کے بعض حصے کی تخریج کرنا چاہیں، تو دونوں ہوگی کہ بالفرض روپے کے ڈالر سے تبادلہ کی یہ صورت جائز ہوتی تو خریدار کا چیک دینا دین کا حوالہ ہے بینک پر، بینک میں رکھی گئی رقم قرض کی حیثیت رکھتی ہے، گویا خریدار نے اپنے اوپر واجب الاداء دین (ثمن) کو اپنے مقروض (بینک) پر حوالہ کر دیا، بینک کا چیک کی ادائیگی سے انکار دین کا "توی" ہے، "توی" کی صورت میں محتال لہ محیل پر رجوع کر سکتا ہے، لہٰذا بینک کا انکار سن کر مالک دوبارہ خریدار سے مطالبہ کر سکتا ہے، اور یہ مطالبہ ڈالر کا ہوگا، روپیہ کا نہیں، کیونکہ ڈالر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ " على مافرضنا "

اب آپ چاہیں تو اوپر ذکر کردہ فقہی مسائل کا حوالہ کتب فقہ سے دیکھ کر لکھ سکتے ہیں (یعنی بیع الدین بالدین کا ناجائز ہونا ہر دین کا حوالہ درست ہونا محتال علیہ سے دین کی وصولی نہ ہو سکنے کی صورت میں دوبارہ محیل پر رجوع کرنا وغیرہ) لیکن اگر آپ عقد کی حقیقت کو سمجھے بغیر ہی کسی جزیئے کی تلاش شروع کر دیتے تو سہل چیز کے حصول کی سعی کے لئے ایسا مشکل راستہ اختیار کرتے جس سے منزل تک پہنچنے کی اُمید خود منزل بنانے اور اس تک جانے کا راستہ بغیر کرنے والوں نے نہیں دلائی۔

حل استفتاء کے اسی طریقے کے متعلق فقہانے فرمایا ہے:

" والغالب أن عدم وجرانه النص لقلة اطلاغه اورعدم معرفته بوضع المسئلة الزكورة فيه ، از قل ماتقع حادثة الا دلها ذكر فى كتب المذهب ،اما بعينها ، اوبذكر قاعدة تشتملها ". (شرح عقود رسم المفتى ص ۳۲).

O جواب اگر کلیات سے دیا ہو تو آخر میں لکھدیں: ''یہ جواب کلیات سے دیا ہے (یا قواعد کو سامنے رکھ کر دیا ہے) کوئی صریح جزئیہ نہیں ملا لہٰذا دوسرے حضرات سے بھی رجوع کر لیا جائے۔'' سائل اگر کلیات سے سوال کرے، مثلاً: کسی شخص نے اپنی ساس کو شہوت سے چھولیا، کیا حکم ہے؟

تو جواب میں لکھدیں کہ کلیات سے سوال کرنا اصول کے خلاف ہے، جزئیات ظاہر کر کے پوری بات لکھو پھر جواب معلوم کرلے ایسے شخص کو ہرگز کلی حکم نہ بتائیں۔ نہ جانے کہاں منطبق کرے۔ پھر اگر وہ صورت مسئلہ بتادے تو ''برتقدیر صحت صورت مسئولہ'' کی تمہید کے ساتھ جواب دیں۔

مراجع ومظان:

سوال کی تحلیل وتحریر اور نکتۃ الغور کی تعیین کے بعد کتب سے مراجعت کی جائے اور مراجعت میں ایک کتاب کو دیکھ کر جواب لکھنا ٹھیک نہیں ہے۔ بلکہ کئی کتابوں میں دیکھ کر جواب لکھا جائے اس کا فائدہ تو یہ ہوگا کہ تمام کتب سے مراجعت میں مسئلہ کے ہر پہلو سے آشنائی حاصل ہوگی اور اس کے ساتھ ساتھ کئی اور مسائل بھی نظر سے گزر جائیں گے، جو وسعت مطالعہ کی کلید اور بوقت ضرورت بہت مفید سرمایہ ہیں، حوالہ ایک کا نقل کر دینا کافی ہے۔ بوقت ضرورت زیادہ بھی نقل کیا جاسکتا ہے۔

O حل استفتاء کے بعد اردو فتاوی سے بھی رجوع میں کوئی حرج نہیں، تاکہ معلوم ہوسکے کہ اکابر نے ایسے استفتاء کے جواب میں کیا تحریر فرمایا ہے، اور ناقل کی تحریر میں ان کی تحریرات سے کتنا بعد ہے؟ خاص طور پر: امداد الفتاوی امداد المفتیین، امداد الاحکام، فتاوی محمودیہ، خیر الفتاوی، جواہر الفتاوی اور جواہر الفقہ کی مراجعت ہونی چاہیئے۔

O اردو فتاوی سے ہو بہو انہیں کے الفاظ سے استفادہ نقل کے مترادف ہے، جس سے کبھی بھی فتوی خود لکھنے کی استعداد پیدا نہیں ہوگی۔ ہاں اگر کوئی خاص مسئلہ مراجعت طلب ہو تو اس میں کوشش کی جائے کہ الفاظ اپنے ہوں، تاکہ منقولہ مضمون کی صحیح تعبیر کی اہلیت پیدا ہوسکے، اور اگر انہی الفاظ کا نقل کرنا ضروری ہے تو راوین میں نقل کیا جائے، تاکہ باقی نہ ہو۔

قاعدہ ہے کہ ایسے مسائل جن میں اشتباہ، التباس ہو یا ان میں اپنے موقف کی تائید وتقویت مفقود ہو تو اردو فتاوی کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے۔ عربی حوالہ میں اردو فتاوی کے حوالوں پر اکتفاء نہ کریں، بلکہ اصل کتاب کی طرف مراجعت کر کے اس کے صفحات اور جلد نمبر لکھیں۔ اگر کتاب دستیاب نہ ہو تو ''بحوالہ فلان کتاب'' کی قید لکھی جاسکتی ہے۔

کتابوں سے مراجعت دل جمعی اور مستقل مزاجی کا کام ہے اس میں پوری ''جد'' صرف کرنے کے بعد ہی ''لم اجدہ'' کا قول معتبر ہوگا۔ اصولوں سے بے دھڑک جوابات کے بجائے جزئیات، تلاش کرنے کی حتی الامکان کوشش کرنی چاہیئے۔ اس لئے فقہی کتب سے واقفیت نہایت ضروری ہے، اس لئے فارغ اوقات میں مختلف کتب فقہ وفتاوی کا وقتاً فوقتاً مطالعہ کرتے رہیں، ایک مرتبہ جس کتاب کو ہاتھ میں لیں، اس سے عمومی اور جامع واقفیت حاصل کرنے کے بعد ہی اس کو رکھیں، یہ وسعت مطالعہ میں اصل ہے۔

O اگر مسئلہ باوجود کوشش کے نہ ملے، تو صاف کہدیں کہ مجھے یہ مسئلہ معلوم نہ ہوسکا، آپ دوسرے حضرات سے پوچھ لیں، زبانی یا تحریری جواب صرف اس صورت میں دیں جب اپنی تحقیق، مسئلہ کی تخریج اور اس کی صحت پر پورا یقین ہوجائے کہ مسئلہ ایسا ہی ہے، جیسا آپ نے سمجھا ہے۔ بغیر تحقیق کے مسئلہ بتانا ناجائز وحرام ہے، مسئلہ نہ آتا ہو تو اس کے لئے "لاادری" کا قانون ہے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

"اذا خطأ العالم لاأدری ، فقد أجیبت فقا تله ..... الخ "

یعنی جب کسی عالم کو مسئلہ معلوم نہیں تھا، اور اس نے اس پر "لاادری" نہیں کہا اور اٹکل سے جواب دیدیا تو اس پر شیطان ونفس کی ایسی ضرب لگی ہے کہ گویا اسے قتل ہی کردیا۔ "مقاتل" ان اعضاء کو کہتے ہیں جن پر ضرب لگنے کے بعد انسان زندہ نہ رہ سکے۔

حضرت ابوالدرداءؓ سے بھی ایسی ہی روایت ہے۔

امام مالکؒ فرمایا کرتے تھے:

" جنة العالم لاادری ، اذا اغفله اصیبت مقاتله "

کہ لاادری عالم کی ڈھال ہے اس کے ذریعہ جہنم سے بچ سکتا ہے۔ جس مسئلہ میں ذرا سا بھی شبہ ہو اس میں صاف کہدیا کہ "لاادری" تو بچ گیا اور اگر "لاادری" کی ڈھال کو استعمال نہیں کیا تو خطرناک چوٹ کھائی جو ہلاک کرسکتی ہے، ایک دفعہ ان سے اڑتالیس مسئلے پوچھے گئے، ان میں سے بتیس میں آپ نے فرمایا: "لاادری" یعنی ایک تہائی کا جواب دیدیا، اور "تہائی کے متعلق فرمایا: "لاادری"، اور ایک روایت ہے کہ آپ سے ایک مرتبہ چالیس مسئلے پوچھے گئے، آپ نے صرف پانچ (یعنی آٹھویں حصے، ثمن) کا جواب دیا، بقیہ کے بارے میں فرمایا کہ: "لاادری"۔

حضرت ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں: "لاادری نصف العلم" آدھا علم لاادری میں ہے، امام مالکؒ کا تو نصف سے زیادہ علم اسی میں تھا۔ اگر چہ یہ کہنا کہ یہ مسئلہ مجھے معلوم نہیں نفس پر بہت گراں ہے، لیکن آخرت کی فکر اور انجام کا استحضار ہو تو یہ کچھ بھی مشکل نہیں، اس میں جو ذلت معلوم ہوتی ہے اسے اللہ تعالیٰ عزت سے بدل دیتے ہیں، سائل بھی آئندہ کے لئے ایسے مفتی پر زیادہ اعتماد کرنے لگتا ہے کہ فلاں مفتی صاحب جو مسئلہ بتاتے ہیں، اس کی ان کو پوری تحقیق ہوتی ہے، ورنہ نہیں بتاتے، لہٰذا جو کچھ وہ بتائیں وہ قابل اعتماد ہے۔

O مفتی کے لئے یہ تو ضروری ہے کہ اپنے امام کی فقہ کے مطابق فتویٰ دے، لیکن اس کی سوچ کا وسیع ہونا، احکام کی علل ودلائل پر گہری نظر ہونا، مسائل کے استنباط کا ملکہ ہونا اور دوسرے مذاہب کی تحقیقات سے واقف ہونا بھی ضروری ہے، دوسرے مذاہب کی تحقیقات سے استفادہ کرنے کے لئے " بداية المجتهد المغنى ، المدونة الكبرى ، الفقه الاسلامى وادلة " دیکھا کریں۔

O سوچ میں وسعت پیدا کرنے کا نسخہ یہ ہے کہ درج بالا کتب کا گہری نظر سے مطالعہ کریں۔

ہر فتویٰ لکھنے کے ساتھ حکم کی تحلیل بھی کیا کریں۔ یعنی وہ منقول من الکتاب والسنۃ ہے یا منقول مجتہد فیہ اگر منقول ہے تو کس سے ثابت

ہے؟ اور اس کا کیا درجہ ہے؟ اگر منقول ہے تو مجتہد کا قول ہے یا بعد کے ائمہ کا؟ اور کس اصل سے ماخوذ ہے؟ نیز وہ اصل کتاب وسنت میں مذکور ہے یا نفس اصل ہی ماخوذ ہوتا ہے؟ پھر اس کی معقولیت اب بھی باقی ہے یا صرف اسی زمانے کے رائج فلسفہ یا مزاج کے تابع تھی؟

تحریر فتویٰ:

اب لکھنا شروع کریں، اولاً رف کاغذ پر لکھا جائے رف کو ''اصلاح اول'' اور اصل کو ''اصلاح دوم'' کہتے ہیں۔ لکھتے وقت ذیل میں دیئے گئے آداب ملحوظ رہیں:

اصلاح اول:

O اصلاح اول میں سطروں کے بیچ اور دونوں جانب مناسب جگہ چھوڑ دیں تا کہ اساتذہ کرام مطلوبہ اصلاح بسہولت کر سکیں۔

O اپنے طور پر فتویٰ میں لکھے گئے حکم کے دلائل (نصاً ہوں یا استدلالاً) خوب تلاش کریں اور ان میں سے اہم فالا ہم کو اصلاحِ اول میں لکھیں بھی، لیکن اصل پر صرف اس قدر حوالے لکھیں جتنے لابدی ہوں جس طرح ایک مدرس اپنے طور پر مسئلے کے مالہٗ وماعلیہ اور مکمل پس منظر سمجھنے کے لئے کئی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے، لیکن طلبہ کے سامنے اتنا بیان کرتا ہے جو نفسِ کتاب کے حل میں مددگار ہو، کبھی کبھی کوئی خارجی بات بھی بیان کر دیتا ہے۔ یہی فرق اصلاح اول و دوم میں ہے۔

اصلاح اول میں آپ مسئلہ کے ہر پہلو کو سامنے رکھ کر تحقیق درج کر سکتے ہیں، ایک سے زیادہ متعلقہ عبارات لکھ سکتے ہیں، چاہے مطلوب صراحۃً ثابت ہو رہا ہو یا دلالۃً، لیکن اصلاح دوم میں وہی درج کریں جو اصلاح دیکھنے والے حضرات نے باقی رہنے دیا ہو، ان کی طرف سے کی گئی قطع و برید کا حتمی مطلب تغلیط نہیں ہوگا، تہذیب کے پیش نظر بھی وہ عبارات کو کم کرتے ہیں، اس سے پست حوصلہ نہ ہونا چاہیئے۔

اصلاح دوم:

O اصلاح دوم میں صاف اور خوشخط لکھنے کی پوری کوشش ہو، پورے پورے حرف ہوں، سب نقطے اور شوشے دیئے ہوں نیز خط متوسط ہو نہ بہت موٹا ہو نہ بہت باریک، اسی طرح حروف سے پشت پر

(۱) ''ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لمعاویۃؓ وکان کاتبہ یکتب بینہ وبین العرب : ''لق الدواۃ وحرف القلم .... وانصب الباء' وفرق السین' ولا تعوّر المیم، وحسن اللہ ومد الرحمن ، وجود الرحیم' وضع قلمک علی اذنک الیسریٰ، فانہ أذکرلک .''

(قولہ': لقِ الدواۃ) بضم اللام وکسر القاف مخففۃ الأمر من لقتہ الوقہ تقول لقت الدواۃ اذا اصلحت مدادھا.

(قولہ: حرف القلم) امر من التعریف ای أجعل القلم محرفاً''.

ترجمہ:۔ ''حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امیر معاویہؓ سے فرمایا (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ آپ کے کاتب تھے) ''دوات کی

سیاہی درست رکھو، قلم پر ترچھا قط لگاؤ ''ب'' کو بڑا کرو، سین کے دندانوں کو واضح کرو، میم کی آنکھ کو خراب نہ کرو ''اللہ'' کو خوبصورت لکھو ''رحمٰن'' کو (یعنی س کو نون کو) دراز کرو، ''الرحیم'' کو عمدگی سے لکھو، قلم کو اپنے بائیں کان پر رکھو، کیوں کہ یہ طریق تجھے خوب مضمون یاد دلانے والا ہے۔۔۔۔۔۔ (نثر المرجان فی رسم نظم القرآن ١/٣٧).

(٢) عن زيد بن حبيب أن كاتب عمر وبن العاص رضى الله عنه كتب الى عمر رضى الله عنه فكتب بسم الله ولم يكتب لها سيناً فضربه عمرؓ فقيل له فيم ضربك يا امير المؤمنين ؟ قال نصربتى فى سين .... (الاتقان ج : ۴ /ص ١٨٠)........

سابقہ مضمون میں اگر چہ یہ باتیں گزر چکی ہیں مگر کچھ مزید اضافہ کے ساتھ شامل کئے جاتے ہیں:

- اہم ''علامات ترقیم'' کا پورا پورا اہتمام کیا جائے۔ سکتہ (،)، ختمہ (۔) اور واوین کا برمحل استعمال لازمی سمجھیں۔
- جہاں سوال کی عبارت ختم ہو وہیں سے متصل نیچے جواب لکھنا شروع کریں۔ صفحے کے آخر میں ''جاری ہے'' یا ''ورق الٹیے'' لکھیں، اگر اسی صفحہ پر جگہ نہیں تو سوال کی پشت پر جواب لکھیں اس میں تزدیر اور جعلسازی سے حفاظت ہے۔
- الجواب حامداً ومصلیاً وغیرہ درمیان میں لکھا جائے۔
- صفحے کے دونوں جانب ایک برابر حاشیہ چھوڑ کر لکھنا شروع کریں۔
- اصلاح دوم میں دائیں طرف نسبتاً زیادہ حاشیہ چھوڑیں تاکہ عکاسی اور جلد بندی میں سہولت رہے۔
- پہلی سطر حاشیے سے تین لفظ کی جگہ چھوڑ کر لکھیں، بقیہ سطریں حاشیہ کے ساتھ سے شروع کریں۔
- ایک پیرا مکمل ہو جائے تو دوسرا شروع کرتے ہوئے بھی پہلی سطر تین لفظ کی جگہ چھوڑ کر اور بقیہ سطریں حاشیے سے شروع کریں۔
- عربی حوالہ نقل کرتے وقت دونوں جانب اردو عبارت کی بنسبت زیادہ جگہ چھوڑی جائے اور اس کے شروع وآخر میں واوین لگا کر اسے ممتاز کیا جائے، یہی طریقہ ہر اس عبارت میں اپنایا جائے جو بلفظ نقل کی جائے۔

ان امور کا اہتمام کریں کہ یہ مسئلہ آداب تحریر میں سے ہیں۔

- جواب مکمل ہو جائے تو " **فقط و الله اعلم** "، لکھیں، عقائد اور اصول کے مسائل میں " **والله الموفق** "، لکھیں۔
- ناقل اپنا نام بھی اسی کے ساتھ یا ایک سطر نیچے لکھے۔
- اصل کاغذ پر دوہری لکھائی یا کاٹ پیٹ ہرگز نہ ہونی چاہیئے۔ کوئی چیز مٹانی ہو تو سلیقے اور صفائی سے سفیدے کے ساتھ مٹائیں، اضافہ کرنا ہو تو " **علامة الالتحاق** " بصورت " **ذنب السهم** " (٧) استعمال کریں۔
- اصلاح دوم میں ترقیم نہ ہوئی یا کاٹ پیٹ پائی گئی تو نہ دیکھی جائے گی۔
- اصلاح دوم لکھنے کے بعد اس پر نظر ثانی کریں، سقط فی النقل کی اصلاح خود طالب علم کی ذمہ داری ہے۔

اجزاءِ فتویٰ:

○ کسی بھی فتویٰ کے عام طور پر تین بنیادی اجزاء ہوتے ہیں۔

(۱) تمہید، (۲) نفس جواب، (۳) خاتمہ۔

(۱) تمہید:

یہ ہر فتویٰ میں نہیں لکھی جاتی صرف طویل یا اہم جوابات کے شروع میں ہوتی ہے اس میں آئندہ تحریر کئے جانے والے حکم کا پس منظر یا ایسے فقہی قواعد یا کلی امور دیئے جاتے ہیں جن پر جواب کی تفریع کی گئی ہو، کبھی ایسے مقدمات لکھے جاتے ہیں جو جواب کی بنیاد اور دلیل کا کام دیں۔ جب حکم میں یک گونہ غرابت و نادر ہو تو اس سے پہلے ایسی تمہید لکھنی چاہیئے جس سے حکم کی وضاحت ہو اور جو اس کے لئے مقدمہ بن سکے۔

(۲) نفس جواب:

یہ سب سے اہم، بنیادی اور مقصودی جزء ہے، اکثر فتاویٰ میں صرف اس پر اکتفا کیا جاتا ہے، یہ دو چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے، حکم اور دلیل۔ کوشش کی جائے کہ یہ جز عقلی و منطقی انداز میں مرتب ہو حکم مسئلہ واضح انداز میں تحریر ہو، دلائل و تفصیل میں منطقی ترتیب اور ربط کا خیال رکھا جائے۔ اگر سوال میں کسی بات کے حق میں دلائل دیئے گئے ہیں یا اشکالات اٹھائے گئے ہیں تو ان کا جواب بھی مناسب معروضی ترتیب کے ساتھ درج کیا جائے۔

(۳) خاتمہ:

تمہید کی طرح یہ جز بھی صرف طویل یا مخصوص فتاویٰ میں لکھا جاتا ہے۔ تمام جوابات میں نہیں، عمومی طور پر اس کا مضمون یہ ہوتا ہے کہ عقائد سے متعلق سوال کے آخر میں سب مسلمانوں کے لئے ہدایت کی، بدعات و رسوم وغیرہ سے متعلق جواب میں ان سے بچنے کی توفیق نصیب ہونے کی، اور اختلافی مسائل میں مسلمانوں کو صراط مستقیم پر قائم رہنے کی دُعا دی جاتی ہے۔ نزاعی مسئلہ ہو تو فریقین کو حکم شرعی مان لینے کی ترغیب دی جاتی ہے وغیر ذلک۔

اُسلوب فتویٰ:

○ فتویٰ کی عبارت معتدل، متوازن اور متناسب ہونی چاہیئے اس میں ایجاز مخل ہو نہ اطناب مملّ۔ حد سے زیادہ اختصار بھی ٹھیک نہیں تحریر میں کسی قسم کا الجھاؤ یا ابہام قبیح عیب ہے اور ضرورت سے زیادہ تطویل بھی مناسب نہیں۔

○ جواب ہمیشہ عام فہم اور آسان زبان میں تحریر کیا جائے تاکہ مخاطب اسے ٹھیک ٹھیک سمجھ لے اور نتیجے تک پہنچنے میں اسے کوئی دشواری نہ

ہو، عملی اصطلاحات اور عربی وفارسی تراکیب استعمال نہ کی جائیں۔

پہلے زمانے میں علم دین کا چرچا تھا اس لئے لوگ علمی وفقہی اصطلاحات سے مانوس تھے، مستفتی خواہ عالم نہ ہو مگر بحیثیت مجموعی مفتی کی مراد ٹھیک سمجھ لیتا تھا، اگر خود نہ سمجھتا تو ہر بستی میں ایسے لوگ موجود تھے جو کنز کافیہ تک پڑھے ہوئے تھے وہ اسے فتویٰ کا مطلب سمجھا دیتے تھے۔

اب صورتِ حال برعکس ہے اس لئے سائل عامی ہو تو جواب کی عبارت اس کی ذہنی سطح کی مناسبت سے عام فہم ہونی چاہیئے، مثلاً آجکل لوگ ''حقوق ثلاثہ مرتبہ مقدمہ علی الارث'' کا مطلب نہیں سمجھتے اس لئے تقسیم وراثت کے مسائل میں اس کے بجائے آسان الفاظ لکھنے چاہیئے، البتہ اگر مستفتی عالم ہو تو جواب علمی زبان میں لکھنے میں حرج نہیں۔

○ مفصل فتوؤں میں بعض اوقات مسئلے کے احکام، اس کے دلائل اور شبہات کے جوابات اس طرح گڑبڑ ہو جاتے ہیں کہ عام پڑھنے والے کا ذہن الجھ جاتا ہے اور سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے نہ صرف پورا فتویٰ پڑھنا پڑتا ہے بلکہ بعض اوقات پورے فتویٰ کو پڑھ کر بھی بآسانی جواب کا خلاصہ ذہن میں نہیں بیٹھتا اس لئے فتوی میں مسئلے کا مختصر حکم اور اس کے مفصل دلائل بالکل ممتاز ہونے چاہئیں تاکہ جو شخص صرف حکم معلوم کرنا چاہتا ہو وہ بآسانی حکم معلوم کرلے اور جس شخص کو دلائل سے دلچسپی ہو وہ دلائل بھی پڑھے، فتویٰ میں عام آدمی کے لئے تو صرف حکم ہی ہوتا ہے، دلائل اہل علم کے لئے ہوتے ہیں۔ اس لئے عام آدمی کو فتویٰ کے شروع ہی میں مختصراً یہ بات واضح طور پر معلوم ہونی چاہیئے کہ جس چیز کے بارے میں سوال کیا گیا ہے اس کا مختصر جواب کیا ہے اس جواب کے بعد اہل علم کے لئے دلائل کی تفصیل، حوالے اور شبہات کے جواب جتنی تفصیل سے چاہیں دیدیئے جائیں۔

خلاصہ:

یہ کہ فتویٰ نویسی کا بہترین اسلوب بقول مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحبؒ یہ ہے کہ ''پڑھنے والے کو سوال کا جواب تو پہلے ہی لفظ سے مل جائے پھر کوئی دلائل پڑھنا چاہتا ہے تو پڑھے، نہیں پڑھنا چاہتا، تو چھوڑ دے، نرا حکم معلوم کرنے کے لئے پورا مفصل فتویٰ پڑھنے کی ضرورت نہ پڑے'' (البلاغ، مفتی اعظم نمبر ۱۳۹۹).....

○ سوال بعض اوقات تہ در تہ ہوتا ہے، اور سوال کرنے والا تمام باتوں کو خلط ملط کر کے پوچھتے ہے ایسے مواقع پر سوال کا تجزیہ و تنقیح کر کے حل طلب امور کی عقلی ''معروضی ترتیب دے کر لکھ دی جائے کہ ''اس مسئلے میں یہ باتیں قابل غور ہیں'' پھر ان منقح امور کا ترتیب وار جواب دیا جائے۔

○ مفتی کے لئے جائز ہے کہ اسلوب الحکیم اختیار کرتے ہوئے اصل پوچھی گئی چیز کی بجائے جو انفع المسائل ہے اسے تحریر کرے۔

قال اللہ تعالیٰ: ''یسألونک ماذا ینفقون قل ما أنفقتم من خیر فللوالدین والاقربین والیتمیٰ''.

○ یہ بھی درست ہے کہ پوچھی گئی باتوں کے علاوہ حسب مواقع مزید مفید باتوں کا اضافہ کر دیا جائے ابتاعاً للحدیث المعروف:

''هو الطهور ماؤه والحل ميتة'' امام بخاری نے اپنی صحیح میں باب باندھا ہے۔

''باب من اجاب السائل باكثر مما سائل'' پھر اس میں حدیث ابن عمرؓ ذکر کی ہے کہ آپؐ سے پوچھا گیا ما يلبس المحرم ؟ آپؐ نے فرمایا: لا يلبس القميص ولا العمائم ولا السراويلات ولا الخفاف .... ا الحديث).

○ جو مسائل بہت واضح ہیں محتاج تفصیل نہیں یا اکثر و بیشتر پوچھے جاتے رہتے ہیں ان میں یجوز یالا یجوز یا مناسب، یا نامناسب جیسے مختصر جواب بھی دیئے جاسکتے ہیں۔

○ مفتی کو اگر صورت واقعہ کا علم ہے اور سوال میں ویسی تحریر نہیں کیا گیا تو سائل سے اصل صورتحال سوال میں لکھوائے یا یہ خود جواب میں یوں لکھے کہ یہ واقعہ چونکہ دراصل یوں ہے۔ لہٰذا اس کا جواب یہ ہے۔

○ جب قرینے سے معلوم ہو کہ جواب مستفتی کی غرض کے خلاف ہے اور وہ اسے اپنے کاغذ پر لکھنا پسند نہیں کرے گا تو اس کو زبانی جواب دینے پر اکتفاء کرنا مناسب ہے۔

○ مفتی کو سائل یا اس کے خصم کی طرف رجحان یا جھکاؤ اختیار نہیں کرنا چاہیئے اس رجحان و میلان کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں۔

مثلاً

(۱) یہ کہ مالہٗ کو ذکر کر دیا جائے ماعلیہ کو چھوڑ دیا جائے۔

(۲) یا دعویٰ کا جواب اور ان سے چھٹکارے کا طریقہ خود سے بیان کرنا شروع کر دیا جائے۔

○ بعض مسائل میں تغلیظ فی الجواب کی ضرورت ہوتی ہے ایسے موقع پر مفتی کو سخت الفاظ لکھنے چاہیئے۔

مثلاً

''یہ مسئلہ قرآن وحدیث، اجماع امت سے ثابت ہے اس میں کسی کا اختلاف نہیں'' یا ''یہ جمہور امت کا مسلک ہے اس سے انحراف سخت گمراہی و بے دینی ہے۔'' یا فوری علیحدگی فرض ہے اکٹھے رہنا حرام کاری کا ارتکاب ہے'' وغیرہ وغیرہ۔

بعض اوقات کسی مسئلے کا جوں کہ توں فقہی حکم بیان کرنے سے مفاسد کا اندیشہ ہوتا ہے، مثلاً ایک چیز فی نفسہٖ مباح ہے لیکن اس کی کھلی چھوٹ دیدینے سے اندیشہ یہ ہے کہ بات معصیت تک پہنچے گی، اور لوگ شرعی حدود پر قائم نہیں رہینگے، ایسے موقع پر مفتی کو یہ بھی مدنظر رکھنا پڑتا ہے کہ اس کام کی حوصلہ افزائی نہ ہو، اور دوسری طرف فقہی حکم میں تصرف بھی نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت مفتی اعظم مفتی محمد شفیع صاحبؒ سے منقول ہے کہ ایسے موقع پر مفتی کو اپنا جواب فتویٰ کے بجائے مشورہ کے طور پر لکھنا چاہیئے۔

ایسے مواقع پر اس قسم کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ ''فلاں عمل مناسب نہیں، یا درست نہیں، یا اس سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

......☆☆☆☆☆......